ذوق وشوق: ایک تعارف

حسن رضا اقبالی

''ذوق وشوق'' علامہ محمد اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس کے مطالعے کے وقت نظم کا پس منظر ذہن میں تازہ رہے تو اس کی تہہ داریاں اور معنوی ابعاد ہم پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک شاہ کار نظم جیسے جیسے ہم اسے پڑھتے جاتے ہیں، ہمارے قلب و روح کو گداز و سرشار کرتی چلی جاتی ہے۔ اُردو میں ''ذوق وشوق'' کے علاوہ شاید ایسی کوئی دوسری نظم نہیں، جس میں نظم کی تخلیق کا محرک، اس کا موضوع اور متن کا مقصود، تینوں ایک ہی ہوں۔ ''ذوق وشوق'' خود اقبال کی نظموں میں بھی اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس نظم کا محرک شوق کا جذبہ، متن کے کل پانچ بند کے تمام تیس اشعار کا مضمون بھی شوق اور اس کے متعلقات اور متن کا ماحصل بھی شوق کی کیفیت ہے۔

۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کے بعد واپسی کے سفر میں بذریعہ ٹرین بیت المقدس پہنچے۔ محمد حمزہ فاروقی اپنی کتاب سفر نامہ اقبال میں لکھتے ہیں:

> اقبال اور غلام رسول مہر ۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو شام چھ بجے قاہرہ سے روانہ ہوئے اور چھ دسمبر صبح ساڑھے نو بجے یہ حضرات بیت المقدس پہنچے۔[۱]

حضرت علامہ ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے۔ اس نظم کا شانِ نزول یہ ہے کہ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ وہ حج کے لیے جائیں اور بلادِ اسلامیہ کا سفر کریں۔ یہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ سے بے پناہ عقیدت اور والہانہ محبت علامہ اقبال کی روحانی زندگی کا سب سے اہم عنصر تھی۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر فلسطین روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے بالِ جبریل کے بیاض میں نظم کے عنوان ''ذوق وشوق'' کے نیچے تحریر کیا ہے ''ان اشعار میں اکثر فلسطین میں لکھے گئے۔'' اس نوٹ سے متصل علامہ اقبال نے لکھا ہے ''بعض جہاز'' اور پھر اس کو قلم زد کر دیا ہے۔ بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نظم کا زمانہ تخلیق علامہ اقبال کے سفر اور قیام فلسطین کا عرصہ ہے اور یہ نظم بالِ جبریل کی جنوری ۱۹۳۵ء کی اولین اشاعت کے صفحات ۵۱ تا ۵۶ پر پہلی بار شائع ہوئی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نظم کے زمانہ تخلیق کا

دورانیہ ۲۷ رجب المرجب ۱۳۵۰ ہجری تا ۶ شعبان المعظم ۱۳۵۰ ہجری بمطابق ۶ / دسمبر ۱۹۳۱ء تا ۱۵ / دسمبر ۱۹۳۱ء ہے یعنی علامہ اقبال نے فلسطین میں ۹ دن قیام کیا اور اسی قیام کے دورانیے میں اس نظم کی تخلیق ہوئی۔

اس نظم کے تاریخی تناظر میں غور کیا جائے تو ان کا مفہوم بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اقبال پر یہ نظم ۱۹۳۱ء میں قیامِ فلسطین کے دوران وارد ہونا شروع ہوئی تھی۔ اقبال فلسطین میں بہ راستہ لندن پہنچے تھے۔ لندن میں وہ دوسری گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ یہ کانفرنس مستقبل کے آزاد ہندوستان کے لیے ایک وفاقی آئینی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ کم و بیش ایک سال پہلے اقبال اپنے خطبہ الٰہ آباد میں برصغیر ہند کے لیے زیرِ غور وفاقی آئین کے تصور کو رَد کر کے برصغیر میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ چنانچہ اس گول میز کانفرنس میں شامل بیش تر مسلمان مندوبین کا سرکار پرست اور برطانیہ نواز رویہ بھانپ کر وہ کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مسلمان مندوبین کی ابن الوقتی کو سمجھنے کے لیے اقبال کے دو خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن میں سے ایک سر آغا خان کے نام اور دوسرا سیٹھ عبداللہ ہارون کے نام ہے۔ سر آغا خان کے نام اپنے خط میں اقبال کانفرنس سے بائیکاٹ کا سبب بتاتے ہیں:

> It is with greatest pain that i am writing this letter to you. I have watched the activities of our Muslims delegation from the every beginig Their secret riviarites, the Intrigues or even disloyally of some of the members have pained me very much. Disgusted with such behaviour I am extremely sorry to inform you that from today I shall have nothing to do with what must be described as a shadow cabinet of the Muslims delegation.[3]

سیٹھ عبداللہ ہارون کے نام اپنے خط مورخہ ۱۶ / جنوری ۱۹۳۲ء میں مسلمان سیاسی رہنماؤں پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتے وقت اقبال کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

> Thanks for your letter which I received a moment ago. I am sorry to tell you that I felt extremely pessimistic about muslims demands in England and that state of mind still continues. Experience has taught me that very few men should be trusted. As to your proposed deputation. I do no wish to say anything for the present. As you know I shall be presiding over the deliberations of the coming conference at Lahore. I must, I think, reserve my views as to what the Muslims of India should do now that their demands have received practically no attention from the premier.[4]

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مذکورہ بالا خطبہ صدارت میں برطانوی وزیر اعظم کی ہندوستانی زندگی کے حقائق سے ناآشنائی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اور گول میز کانفرنس کے

مسلمان مندوبین کی سرکاری سرپرستی کو بھی۔ انھوں نے اسلامیانِ ہند کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہر دو فریق کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ کر ایک آزاد راستے کا انتخاب کریں۔ یہ وہی راستہ ہے جس کی نشاندہی وہ کم وبیش ایک سال پہلے اپنے خطبہ الٰہ آباد میں کر چکے تھے۔

یہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام کی راہ تھی۔ گول میز کانفرنس کے بعد انھیں مؤتمر عالم اسلامی کے فلسطین میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ چنانچہ وہ فرانس میں برگساں اور لوئی مسینیوں اور اٹلی میں مسولینی اور افغانستان کے سابق بادشاہ امان اللہ خان سے ملاقات کے بعد ۶ دسمبر کو بیت المقدس پہنچ گئے۔ گول میز کانفرس کی طرح مؤتمر عالم اسلامی کی کانفرنس سے بھی وہ کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی ۱۵؍دسمبر کو واپس چلے آئے۔ اس نو روزہ قیام کے دوران انھوں نے فلسطین کی سیر کے ساتھ ساتھ مؤتمر کے اجلاسوں میں مسلمان ملکوں کے حکمران طبقے کے اعلیٰ نمائندوں سے ملاقات کی اور روانگی سے ایک روز پیش تر کانفرنس سے انگریزی میں خطاب کیا۔

اپنے خطاب میں جہاں انھوں نے ملتِ اسلامی کو درپیش خطرات کی نشاندہی کی، وہاں انھوں نے دنیائے اسلام کے سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں کو دل سے مسلمان بننے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے خبردار کیا کہ:

> اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں۔ اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روحِ طاہر ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بُری چیز نہیں ہے لیکن اگر اس میں خاص اعتدال کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط وتفریط پیدا ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی پیدا کر دینے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں ہے لیکن خود مسلمانوں سے مجھے اندیشہ ہے۔ میں تو جب بھی سوچتا ہوں شرم وندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسولؐ ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسولؐ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضورؐ ہم پر فخر کریں۔[۵]

اقبال کی اس گفتگو کی روشنی میں اگر ہم دوسرے بند کے اشعار کو پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ اس نظم کا فوری محرک وہ گہری مایوسی ہے جس نے لندن کی گول میز کانفرنس اور مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس کے دوران اقبال کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہاں اقبال کو دنیائے اسلام کے سیاسی زعماء علمائے دین اور دانشورانِ کرام سے بالمشافہ ملاقاتوں اور مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاسوں میں ان کی طرزِ فکر واظہار سے براہِ راست شناسائی کا موقع ملا تھا۔ یہاں کی باتیں اور ملاقاتیں ان کے لیے مایوس کُن ثابت ہوئی تھیں۔ اقبال کی نظر میں مؤتمر عالم اسلامی بھی ایک ایسا ہی بُت کدہ ہے۔ جب دوسری مرتبہ اقبال کو مؤتمر کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انھوں نے یہ سوچ کر اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ تو فرنگی سامراج ہی کا ایک ادارہ ہے۔ مؤتمر

کے استعماری کردار کی یہ بات بیش تر مسلمانوں کو ناقابلِ یقین نظر آئے گی۔اس لیے یہاں ڈاکٹر تاثیر کی ایک تحریر سے ایک طویل اقتباس پیش کرنا ہے:

جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ایک اور بات بھی جو قابلِ ذکر، ہوئی تھی، اس کا تعلق سیاست سے بھی ہے اور علامہ اقبال کی اپنی ذات سے بھی، ڈاکٹر صاحب کو آکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔ میں ان دنوں کیمبرج میں تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو اصرار سے لکھا کہ وہ اس دعوت کو رَد نہ فرمائیں۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کا سفر انگلستان سیاسی حیثیت رکھتا تھا۔ روڈز لیکچر کی علمی حیثیت تھی۔ انگلستان کے ادیب اور اہل علم لوگوں نے زمان ومکان کے مسئلے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمان ومکان کے اسلامی تصور پر لیکچر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان لیکچروں کا پہلے سے چرچا کر رکھا تھا۔ ذاتی اور قومی فخر کے ساتھ اقبال کے ادبی مرتبہ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک خط میں یقین دلایا کہ میں ضرور آؤں گا لیکن یکا یک ان کا ایک اور خط آیا اور اس میں لکھا کہ انھوں نے ارادہ منسوخ کر دیا ہے مجھے اس کا بہت رنج ہوا۔ اس ملاقات میں وہ راز بھی منکشف ہوا۔ روڈز لیکچر کی دعوت لارڈ لوتھین کے ذریعے آئی تھی۔ لارڈ لوتھین علامہ کا بہت مداح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے کیمبرج میں ایک ملاقات کے دوران مجھ سے کہا تھا''عالم اسلام ہی میں نہیں تمام مشرق میں اقبال جیسا اثر انداز مفکر اور کوئی نہیں''۔ یہ بھی کہا کہ''اقبال کے افکار تاریخ عالم کا رُخ بدل دیں گے۔ سیاسی لوگ نہیں جانتے کہ اقبال کی طرح کے شاعر کس قدر مؤثر ہو سکتے ہیں۔''

اسی لوتھین نے علامہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فلسطین آکر مؤتمر اسلامی میں شریک ہوں اور اسلامی ممالک تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ بہ ظاہر یہ اچھی بات تھی۔ علامہ اقبال نے وعدہ کر لیا لیکن انھیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ یہ مؤتمر برطانوی سامراج کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھی۔ اقبال برطانوی سامراج کا سخت دشمن تھا۔ روڈز لیکچر اور اس مؤتمر کی تاریخیں پاس پاس تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مروّت کے پتلے تھے، وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ ممکن ہو تو مؤتمر میں شریک ہوں گے۔ مؤتمر سے بچنے کا یہی طریقہ نظر آتا ہے کہ آکسفورڈ نہ جائیں۔[۶]

حمزہ فاروقی نے اپنی کتاب سفر نامہ اقبال میں اس بات کا انکشاف بھی فرمایا ہے کہ عرب نوجوانوں میں مؤتمر کے انعقاد کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں لیبر پارٹی کے نمائندے بھی اس کے ممکنہ نتائج سے خوف زدہ تھے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ میں جب ایک رُکن نے اپنی تقریر میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ مجوزہ کانفرنس میں مسلمان مندوبین کی تقریروں سے''یہود ونصاریٰ کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی جذبات مشتعل ہوں گے۔'' تو وزیرِ نوآبادیات سر رابرٹ ہمیلٹن نے جواب دیا تھا کہ:

مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نظر نہیں آتا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہائی کمشنر سے تحقیقات کرنے پر مجھے علم ہوا ہے کہ مفتی اعظم کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور وہ کانگرس کی کارروائی ایسے طریق پر انجام دیں گے کہ برطانوی یا فلسطین کی حکومت کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔[۷]

مؤتمر کی افسردہ و مردہ قراردادوں سے بھی اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ آج ہی نہیں بلکہ اپنے آغاز میں بھی یہ مؤتمر ایسی ہی بے جان اور پُر فریب تنظیم تھی۔ ینگ مین کرسچیئن ایسوسی ایشن کے عکس پر ینگ مین مسلم ایسوسی ایشنوں کے قیام سے لے کر جدید عربی لغت کی تیاری اور حجاز ریلوے تک اس کی قراردادوں میں کہیں بھی عشق کی آنچ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اقبال نے بہت اچھا کیا کہ کانفرنس کی تکمیل سے پہلے ہی مندوبین کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے بتوں کو توڑنے کا مشورہ دے کر لاہور واپس آ گئے۔ یہ ہے وہ تاریخی، سیاسی اور تہذیبی تناظر جس کے بغیر ''ذوق وشوق'' کی تفہیم وتحسین ناممکن ہے۔

اگر اس نظم کے ادبی پس منظر کو دیکھا جائے تو اقبال نے نظم کے آغاز ہی میں ''ذوق وشوق'' کے حسب و نسب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کوہ اضم، اور نواح کاظمہ، قصیدہ بردہ سے آئے ہیں جو ایک معروف نعتیہ قصیدہ ہے۔ مناسب ہے کہ اس موقع پر قصیدہ بردہ کا خلاصہ ذہن میں تازہ رہے۔ عام عربی قصائد کی طرح اس قصیدے کی ابتدا بھی ارضی عشق سے ہوتی ہے۔ عاشق و معشوق دونوں ذی سلم کے مقام پر کچھ مدت تک مقیم رہے ہیں۔ اب معشوقہ کا قبیلہ کوچ کر کے کوہ اضم کے دامن میں قیام پذیر ہو گیا ہے۔ فراق اور تنہائی کا مارا عاشق، معشوقہ کی پہلی جائے قیام پر جاتا ہے اور بجھے ہوئے چولھے اور خیمہ گاہ کو دیکھ کر رو پڑتا ہے۔ اس کا ساتھی اس سے پوچھتا ہے کہ کہیں کل رات جانب کاظمہ سے چلنے والی ہواؤں اور کوہِ اضم پر کوندنے والی بجلیوں نے اسے معشوق کی یاد تو نہیں دلا دی مگر عاشق رازِ عشق چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن وہ یہ راز ہے کہ کبھی چھپائے نہیں چھپتا۔ بالآخر عاشق کو جرم عشق کا اقرار کرنا پڑتا ہے اسی کے ساتھ وہ معشوق حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور نعت خوانی شروع کر دیتا ہے۔ پھر حضورﷺ پُر نور کے فضائل، اُنؐ کے پاکیزہ اخلاق و عادات، اُنؐ کی ولادتِ باسعادت، فضیلت قرآن، واقعۂ معراج، معجزاتِ نبویؐ، خصائل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور عظمتِ جہاد کا تذکرہ کرتا ہے اور عرضِ حال پر نعت کا خاتمہ کرتا ہے۔

عربی روایت کے مطابق عاشق اس مقام پر جاتا ہے جہاں معشوق کا قبیلہ پہلے مقیم رہا ہے۔ اور وہاں بجھی ہوئی آگ اور افسردہ خیمہ گاہ جیسے آثار دیکھ کر آب دیدہ ہو جاتا ہے۔

اقبال نے اس بے جان رسم (Ritual) کو علامتی رنگ دے کر تاریخ کی وسیع وعریض گزرگاہ بنا کے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اس شعر کو آنکھیں بند کر کے پڑھ لیجیے تو نوعِ انسانی کی پوری سرگزشت ایک منظرِ مسلسل (Panorama) کی طرح چشمِ تصور کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ہمارے شاعر کو جو کہ جتنا بڑا فن کار ہے، اُتنا ہی بڑا مفکر بھی ہے۔ (''ذوق وشوق'' اقبال کے فکر وفن کے امتزاج کا ایک بہترین نمونہ ہے) یہی گزرگاہ ایک موقف عطا کرتی ہے۔

مرزا محمد منور لکھتے ہیں:

کلامِ اقبال پر عربی اثرات مختلف انداز میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ کچھ باتیں صاف اور صریح ہیں۔ کچھ علامت بن گئی ہیں اور کچھ تصاویر خیالی ہیں۔ لطف وہاں آتا ہے جب وہ عرب کی ادبی روح کو اپنے شعروں میں سمو دیتے ہیں۔ جہاں ان کی تشبیہیں، استعارے اور تلمیحیں اور خیالی تصویریں قاری کے ذہن کو عربی ماحول کی طرف منتقل کر دیتی ہیں۔ ''ذوق وشوق'' کا آغا اپنی معنوی خوبی کو جبھی واضح کرتا ہے کہ اسے عربی ادب کے آئینے میں دیکھا جائے...... ''کوہِ اضم'' اور ''ریگِ نواحِ کاظمہ'' کے اندر مدینہ منورہ کی یاد مضمر ہے...... وہ عالم خیال میں مدینہ منورہ کی سیر وزیارت کر رہے تھے۔[۸]

اس نظم کے سوانحی پسِ منظر کی تفصیل یہ ہے کہ ۷ر ستمبر ۱۹۳۱ء میں حضرت علامہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ لندن میں مسلمان راہنما شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس مستقبل کے آزاد ہندوستان کے لیے ایک وفاقی آئینی ڈھانچہ تعمیر کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں شریک بیشتر مسلمان مندوبین کا سرکار پرست اور برطانیہ نواز رویہ بھانپ کر علامہ اقبال کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسی تاریخی تناظر میں دوسرے بند کے اشعار کو سمجھنا چاہیے۔

ان کا یہ سفر کئی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انگلستان میں انھوں نے برصغیر کے دستوری معاملات میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا اور بہت سی علمی وادبی انجمنوں کے جلسوں سے خطاب کیا۔ جو اِن کے اعزاز میں منعقد کیے گئے۔ واپسی میں اٹلی کی رائل اکیڈمی کی دعوت پر روم آئے، یہاں کے اہلِ علم نے دل کھول کر ان کی قدر افزائی کی۔ اکیڈمی میں ان کا لیکچر ہوا۔ اٹلی کے مردِ آہن مسولینی نے شاعرِ مشرق سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

روم سے حضرت علامہ محمد اقبال مصر آئے۔ مصر کے علمی و سیاسی حلقوں نے بھی ان کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کی۔ ۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو حضرت اقبال سے ملاقات کے لیے مصر کے مشہور صاحبِ طریقت بزرگ سید محمد ماضی ابوالعزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اس دوران علامہ اقبال ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اقبال ان کو یوں ہوٹل میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئے اور کہا کہ حضرت آپ نے تکلیف کیوں کی، میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔ انھوں نے فرمایا:

> خواجہ دو جہاں حضور ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں تاکہ میرے آقا ﷺ مجھ سے خوش ہوں۔[۹]

علامہ اقبال اُن کی یہ بات سُن کر بے تاب ہو گئے اور اُنھیں چپ سی لگ گئی۔ سید ابوالعزئم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے اور اقبال خاموشی سے سُنتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو اقبال سے نہ رہا گیا۔ آنسوؤں کا سیلاب بے اختیار ان کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ فرمایا:

> ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو مستمک بالدین سمجھ کر حضور ﷺ خواجہ دو جہاں کے ارشاد کے

اتباع میں بغرض خوشنودی ملنے آتے ہیں۔[۱۰]

۳ دسمبر کو پھر دوسری دفعہ سید ابوالعزائم نے حضرت اقبال کو اپنے گھر دعوت دی تو حضرت علامہ سید ابو العزائم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہاں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید ابوالعزائم نے بمطابق معمول اپنے ناصحانہ انداز میں کہا کہ جب مسلمانوں کی تعداد صرف چند لاکھ تھی تو دُنیا کی عظیم سلطنتیں ان کے قدم چومتی تھیں اور جب وہ چالیس کروڑ ہیں تو ہر جگہ کفار اِن پر مسلط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے اور اس کی روح سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ پھر اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اس دل میں اسلام کی محبت اور رسول ﷺ کی خاطر شیفتگی نظر آتی ہے۔[۱۱]

نظم ''ذوق وشوق'' اسی شیفتگی اور دردمندی کا سبب بنی جس کی پیش گوئی سید ابوالعزائم نے فرمائی۔ ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ ۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال قاہرہ کا میوزیم دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد لوگوں کی خواہش پر تقریر کی۔ تقریر مختلف موضوعات پر تھی جس میں بالخصوص قرون اولیٰ کی اسلامی فتوحات، دورِ جدید میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہندوستان کی سیاسیات نمایاں تھے۔

۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو جامعہ از ہر پہنچے۔ جامعۃ الازہر میں کچھ دیر طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر تفسیر، حدیث اور منطق کے دروس سُنے۔ جامعہ کا نیا حصہ جہاں طلبہ کو علومِ جدید کی تعلیم دی جاتی ہے اور طبیعات، کیمیا وغیرہ کے شعبوں کا معائنہ فرمایا۔ اقبال نے جامعہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے شیخ از ہر شیخ مصطفیٰ المراغی سے فرمایا:

راستہ وہی ہے گو قافلہ بدل گیا ہے۔ اس لیے اگر آپ موجودہ قافلے کی وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ضروریات کا خیال نہ کریں گے تو مقصد کی تحصیل میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔[۱۲]

تیسرے بند میں اسی تاریخی تناظر کے تحت اشعار کہے گئے ہیں:

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ مے کدہ کم طلب و تہی کدو[۱۳]

مصر میں پانچ دن گزارنے کے بعد بذریعہ ریل فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔ مولانا شوکت علی اور حافظ عبدالرحمٰن بھی ان کے ہمسفر ہو گئے اور اقبال مصریوں کی محبت وشفقت کا ایک نہ مٹنے والا نقش اپنے دل میں لے کر رخصت ہوئے۔

مفتی صاحب نے دسمبر ۱۹۳۱ء بیت المقدس میں منعقد ہونے والی مؤتمر اسلامی کانفرنس کی شرکت کے لیے دعوت نامہ بھیج رکھا تھا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے علامہ بیت المقدس (یروشلم) پہنچے، بارش ہو رہی تھی۔ اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے مفتی سید امین حسینی، مولانا شوکت علی اور مؤتمر اسلامی کے منتظمین موجود تھے۔ یہ مؤتمر مفتی سید امین الحسنی اور ان کے رفقا کی طرف سے اتحاد اسلامی کے نصب العین کی خاطر منعقد کی گئی۔

مؤتمر کا تعارفی اجلاس ۶ ردسمبر ۱۹۳۱ء کو شام ۴ بجے روضۃ المعارف کے وسیع وعریض ہال میں ہوا۔ اس وقت خوب بارش ہو رہی تھی اور اجلاس کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ جس میں مندوبین کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا گیا۔ اس کے بعد علامہ اور دیگر مندوبین رضا کاروں کی معیت میں مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوگئے۔ رضا کار مل کر عربی زبان میں قومی نغمے گاتے جا رہے تھے۔ راستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر اقبال رُک گئے۔ فاتحہ پڑھی اور پھر مسجد اقصیٰ پہنچے۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ نماز کے بعد مسجدِ اقصیٰ میں محفل اسریٰ منعقد ہوئی جس میں قرآن کریم کی تلاوت اور نعت خوانی کی گئی۔ چند اصحاب نے آیاتِ اسریٰ کی تفسیر بیان فرمائی۔ محفل کے اختتام تک نماز عشاء کا وقت ہو گیا تھا اور مسجد اس وقت پوری طرح بھر چکی تھی۔ سب نے نمازِ عشاء پڑھی۔ ۷ ردسمبر کی صبح کو حضرت علامہ مسجد اقصیٰ کے باہر سیر کے لیے جاتے ہیں، صبح کا دل آویز منظر ان کو بہت متاثر کرتا ہے۔ شاعر عالمِ خیال میں نواحی مدینہ میں پہنچ جاتا ہے۔ شاعر کا دل اُس ارضِ پاک میں ہے اور وہاں کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اقبال مدینہ منورہ کے آس پاس کے ایک نورانی، پاکیزہ اور دل کش صبح کے منظر کو محسوس کرتے ہیں۔ اور ایک شاداب صبح کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ہے اور عرشِ معلیٰ سے سینۂ اقبال پر ضمیرِ کُن فکاں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ یہ وجدانی لمحہ اپنی پوری توانائی اور روشنی سے الفاظ کے سینے میں ڈھل کر صبح حجاز کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔ (فلسطین میں) ۶ دسمبر کی رات میں بارش ہو چکی ہے، پانی برسنے سے برگِ نخیل گرد وغبار سے پاک ہو گئے ہیں اور نواحِ مدینہ کی ریت پرنیاں کی طرح نرم ہو گئی ہے۔ رات کی بارش کے بعد جو سرخ و نیلی بدلیاں رہ گئی ہیں انھوں نے کوہِ اضم کو رنگ برنگ لباس پہنا دیا ہے۔ اور شاعر پر الہامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور بے ساختہ ہو کر کہہ اٹھتے ہیں:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سُود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دُھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں[۱۴]

۱۶ ردسمبر ۱۹۰۵ء میں عدن کے مقام پر جب پہنچے تب حضرت علامہ پر صبح کے وقت یہی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ نثری پیرائے میں اس کا اظہار انشاء اللہ خان انشاء کے نام ایک خط میں کرتے ہیں:

آج ۱۶ر دسمبر کی صبح ہے۔ میں بہت سویرے اُٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمۂ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسا ہمارا دریائے راوی۔ شاید صبح کے پُر تاثیر نظارے نے اس کو سمجھا دیا کہ سکون قلب بھی ایک نایاب شے ہے۔ ہر وقت کی اُلجھن اور بے تابی اچھی نہیں۔ طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دِل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ یہی آفتاب ہے جس کے طلوع وغروب کو میدان میں ہم نے کئی دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں سمندر میں اس کی کیفیت ایسی ہے کہ ''نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد''۔ [۱۵]

مسجدِ اقصیٰ میں عالمِ اسلام کے نمائندوں کا اجتماع، جشنِ معراج اور اس موقع پر علامہ رشید رضا کی تفسیر آیاتِ معراج، عالم اسلام کے کرب واضطراب کا جائزہ، یہ سب باتیں عندلیب باغِ حجاز کو تڑپانے کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ اس روح پرور ماحول اور پُر کیف فضا کے ساتھ ساتھ غمِ ملت، اس سارے پس منظر میں ''ذوق وشوق'' کی کیفیات اُجاگر ہوتی ہیں۔

۷ر دسمبر کو مؤتمر کا اجلاس ہوا۔ مجمع میں یہ طے پایا کہ جو سب سے معمر شخص ہو اس کو صدر منتخب کیا جائے۔ تو مفتی سید امین الحسینی کو مستقل صدر کی حیثیت سے اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ علامہ اقبال (ہندوستان)، محمد علی پاشا (مصر)، سید ضیاالدین طباطبائی (ایران)، اور سید محمد زیاد (یمن) نائب صدر منتخب ہوئے۔ فلسطین میں اقبال کا قیام ۹ روز رہا۔ یہ شب وروز شدید مصروفیت میں گزرے۔ اس سفر کا اصل مقصد مؤتمر اسلامی میں شرکت تھا۔

مؤتمر اس سے قبل دوبار منعقد ہو چکی تھی۔ پہلی بار قاہرہ میں محدود پیمانے پر ہوئی تھی۔ دوسری بار ۱۹۲۶ میں سلطان ابن سعود نے مکہ معظّمہ میں منعقد کی تھی۔ اگرچہ پہلی مؤتمر کی نسبت اس میں نمائندگی زیادہ تھی تاہم اس میں بھی چند ممالک کے نمائندے شامل نہ ہو سکے تھے۔ اور موضوع بھی مسئلہ حجاز تک محدود رہا۔ موجودہ کانفرنس کے داعی سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین تھے اور نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو رہی تھی۔ اس میں تقریباً ۲۷ ملکوں اور علاقوں کے مندوبین شامل تھے۔ اس میں اربابِ علم وفضل بھی تھے اور سیاسی راہنما بھی۔ اس طرح متعدد واجب الاحترام بزرگ شخصیات اور مجاہدین آزادی اور اپنے اپنے ملکوں کی سیاست میں سرگرم ممبران پارلیمنٹ بھی گویا قبلہ اول کے شہر میں عالم اسلام کی منتخب شخصیتیں جمع تھیں۔

گذشتہ کئی ماہ سے اس کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ عالم اسلام کے مخدوش اور پریشان کُن حالات بھی اس کے انعقاد کا ایک سبب بنے۔ کانفرنس کی طرف سے حسبِ ضرورت سواری اور راہ نما میسر رہتا تھا۔ ایک روز بیت المقدس سے چالیس میل دور جنوب میں واقع الخلیل (جبرون) دیکھنے گئے۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے بیت اللحم رُکے یہاں کلیسا کے مولد مسیح کی زیارت نے اقبال کو متاثر کیا۔ بیت اللحم حضرت داوٗدؑ کی جائے ولادت ہے۔

بیت اللحم سے الخلیل جاتے بڑے بڑے تالاب دکھائی دیئے۔ روایت ہے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے تعمیر کردہ ہیں۔ الخلیل بنی اسرائیل کے بہت ابوالعزم پیغمبروں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ اور بعض انبیاء کی ازواج کا مدفن بھی ہے۔ بیت المقدس شہر میں بھی انھوں نے سب سے قابلِ دید مقامات، عمارات اور آثار دیکھے۔ حرم مقدس کے اندر جاتے اور وہاں نماز بھی پڑھتے اور مسجد عمر فاروق قبۃ الصخرہ وغیرہ کی زیارت کا تو اقبال کو بار بار موقع ملا ہوگا۔ ۱۴ر دسمبر فلسطین میں اقبال اور مہر کے قیام کا آخری دن تھا اس روز شام کی نشست میں اقبال نے موتمر میں ایک تقریر کی۔ جس میں عالم اسلام کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت سے خطرہ ہے ...... میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔ اقبال نے کانفرنس سے متعلق دیگر مسائل پر بھی اظہار کیا۔

پھر ۱۴ر دسمبر کی شام انھوں نے موتمر کے مندوبین سے الوداعی خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> میں کبھی سوچتا ہوں تو شرم وندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول ﷺ ہم پر فخر کریں، ہاں، جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کرلیں گے جو رسول ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہوسکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے تسلسل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہوجائے گا۔[۱۶]

۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح اقبال اور غلام رسول مہر بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ مفتی امین الحسینی، ضیاء الدین طباطبائی اور دیگر احباب انھیں الوداع کہنے کے بعد اسٹیشن پر آئے۔ ۶ بجے گاڑی قنطرہ پہنچی۔ سفر کے دوران اقبال کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ ۱۶ دسمبر کو رات کا کھانا ڈاکٹر سلیمان اور ان کی بیگم پینا کے ساتھ کھایا۔ ۱۷ دسمبر کی شب صدیق محمد نادرک کی دعوت میں شرکت کی اور رات ۱۲ بجے ہسنا نامی جہاز میں سوار ہوئے اور ۱۸ دسمبر ۱۹۳۱ صبح چار بجے پورٹ سعید سے روانہ ہوئے۔ عدن کی بندرگاہ پر جہاز چند گھنٹوں کے لیے رُکا اور اقبال گھنٹہ بھر سیر کے لیے اُترے۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے بالِ جبریل کی بیاض میں نظم کے عنوان ''ذوق وشوق'' کے نیچے تحریر کیا ہے: ''ان اشعار میں اکثر فلسطین میں لکھے گئے۔'' اس نوٹ سے متصل علامہ اقبال نے لکھا ہے ''بعض جہاز'' اور پھر اس کو قلم زد کر دیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نے مذکورہ نظم کے کافی اشعار فلسطین میں لکھے اور بعض دورانِ سفر جہاز میں لکھے۔ جب علامہ صاحب سیر کے لیے جہاز سے اُترتے ہیں تب گنبد آبگینہ رنگ کے نیچے سمندر کا نظارہ کرتے ہیں تو اسی دوران حضرت علامہ پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ عالمِ سوز وساز میں فراقِ نبوی ﷺ میں مدینہ جا پہنچتے ہیں اور فرطِ طرب سے حضور ﷺ کی بارگاہ میں مخاطب ہوکر بے ساختہ کہتے ہیں:

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دِیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مُراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب[۱۷]

دوسری بار ایسے ہی موقع پر جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جاتے ہیں تو ان کا جہاز پورٹ سعید پر رُکا تو عالمِ خیال میں حضورﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے عرب کی مقدس سرزمین کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو دیارِ مدینہ میں محسوس کرتا ہے۔ انشاء اللہ خاں کو لکھتے ہیں:

اے عرب کی مقدس سرزمین تجھ کو مبارک ہو تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رَد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دُنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مار پیٹ کے باغ سے باہر نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروانہ کی مگر اے پاک سرزمین! تو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے نورظہور کیا تا کہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھولوں کو ان کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس قدم دیکھے ہیں...... کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں اور دُنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی ہے۔[۱۸]

۱۰ دسمبر کو حضرت اقبال بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ علامہ نے ۹ دن بیت المقدس میں قیام فرمایا۔ مصر میں ۶ دنوں اور بیت المقدس میں ۹ دنوں کی مصروفیات، ملاقاتوں، زیارات، اور عالم اسلام کی مشکلات مسائل اور مستقبل میں احیائے ملت کے امکانات پر غور کرتے رہے ہوں گے۔ ان کے ذہن کی سکرین پر ایک فلم ہی چل رہی ہوگی۔ اس میں قاہرہ، بیت المقدس، جامعہ الازہر، الخلیل، انبیاء کے مزارات، قبۃ الصخرۃ کے مناظر کے ساتھ فلسطین کی حدود سے آگے سرزمین حجاز کی وادی بطحا اور مدینہ کے مناظر ہی سامنے آئے ہوں گے۔

❁...❁...❁

حوالہ جات وحواشی

۱- محمد حمزہ فاروقی، سفر نامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۹

۲- سید مظفر حسین برنی، کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد دوم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۳

۳- بشیر احمد ڈار، Letters and writing of Iqbal، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۸-۹

۴- ایضاً، ص ۹-۱۰

۵- محمد حمزہ فاروقی، سفر نامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۴۲

۶- ایم ڈی تاثیر، اقبال کے حضور، مشمولہ رسالہ فنون، شمارہ ۲۱، ۱۹۷۵ء، ص ۴-۱

۷- محمد حمزہ فاروقی، سفر نامہ اقبال، ص ۲۲۸

۸- مرزا محمد منور، ایقان اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۷۶

۹- جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ج ۱، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۸

۱۰- ایضاً، ص ۱۰۸

۱۱- ایضاً، ص ۱۰۹

۱۲- ایضاً، ص ۱۲۳

۱۳- محمد اقبال، علامہ، بال جبریل، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۷۶

۱۴- محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۴۳۸

۱۵- مظفر حسین برنی، سید، بنام انشاء اللہ خان انشاء، اردو اکادمی، دہلی، ص ۲۳۹

۱۶- جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، ص ۱۹۸

۱۷- ایضاً، ص ۱۱۲

۱۸- محمد اقبال، علامہ، بالِ جبریل، لاہور، تاج کمپنی براتھ روڈ، ۱۹۳۵ء، ص ۹۷

۱۹- سید مظفر حسین برنی، کلیاتِ مکاتیب اقبال، ص ۲۲۳